Date of Publication: 23-12-2013 PRICE Rs. 2/-

POSTED ON 24-25 Dec. 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U (C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

1-7 January 2014 — یکم تا ۷ر جنوری ۲۰۱۴ء

Issue: 1, Vol.: 73 — شمارہ نمبر: ۱، جلد نمبر: ۷۳

آج پورا ہندستان قومی یک جہتی کے مسئلے سے دوچار ہے۔ ادیب، شاعر، دانشور اور عام انسان غرض کہ سب کے سب ملک اور قوم کے بگڑتے ہوئے حالات اور قومی یک جہتی کی بگڑتی ہوئی صورتوں سے پریشان اور فکرمند ہیں۔ اس اہم مسئلے پر سب اپنی اپنی گراں قدر رائے بھی رکھتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے ''مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا'' کوئی کہتا ہے کہ ہندی اور اردو میں تو صرف اسکرپٹ کا فرق ہے ورنہ یہ دونوں تو ایک ہی ماں کی دو بیٹیاں ہیں۔ کوئی تعلیمی ڈھانچے کو ناقص قرار دیتا ہے، کوئی فرقہ پرست سیاست کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے اور کوئی سرمایہ دارانہ نظام کو۔ غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ ان تمام آرا کے خلوص اور نیت پر شک کیے بغیر عرض کیا جا سکتا ہے کہ اس اہم موضوع پر گزشتہ کئی دہائیوں سے یہ قول آج بھی اسی میں پھنسا پڑا ہے''۔ سرکاری اور غیر سرکاری تمام کوششوں کے باوجود یہ باہمی دلدل سے کیوں نہیں نکل سکا ہے؟

ہندستان کی موجودہ اور پیچیدہ سیاسی اور سماجی صورت حال کے پیش نظر اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مذہبی تنگ نظری سے نبرد آزما ہونے، لسانی یک جہتی بحال ہونے، عید ملن، ہولی ملن کرنے اور سمینار، سمپوزیم کرنے سے قومی یک جہتی کا مزاج قائم ہو جائے گا تو بصد معذرت عرض کروں کہ صورت حال اتنی بگڑ چکی ہے کہ ان صورتوں اور کوششوں سے اب یہ ممکن نہیں رہا۔ اس سے یہ بھی مراد نہ لی جائے کہ ایسے کام نہیں ہونے چاہیے۔ ضرور ہونے چاہیے اس سے غور و فکر کی راہیں تو نکلتی ہی ہیں۔

گزشتہ برسوں کے قیمتی لمحات ہم نے خود اس اہم مسئلے پر صرف کیے ہیں،

پہلی قسط

قومی یک جہتی کا بنیادی مسئلہ

پروفیسر علی احمد فاطمی (شعبۂ اردو، الہ آباد یونی ورسٹی، الہ آباد)

ممتاز ہندی ادیب و دانش ور امرت رائے ''خدا جانے کتنا لکھا گیا، کتنی تقریریں کی گئیں، کتنے ریزولیشن پاس کر کے کیسے کیسے عہد و پیمان کیے گئے مگر قومی یکجہتی کا ہاتھی جس دلدل میں پھنسا ہوا تھا

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ نفرت اور عصبیت کا تیر جب جب چلا ٹھیک نشانے پر بیٹھتا رہا کہ تیر چلانے والے کمزور ذہن کے ان کمزور گوشوں سے واقف ہیں جہاں ان کا تیر پیوست ہو چکا ہے لیکن اس کے مقابلے میں قومی یک جہتی کا تیر کم چلا اور جب چلا اندھیرے یا خلا میں گم ہوتا رہا۔ قومی یک جہتی کا پھیکے رنگ کا بدمزہ شربت ہم قوم کو پلاتے رہے اور دوا کرتے رہے لیکن تیزی سے اثر کرتا ہوا فرقہ پرستی کا زہر قوم کے جسم میں ناسور بنتا گیا اور اب صورت یہ ہے کہ آج یہ مرض ایک بے حد پیچیدہ اور ناقابل برداشت مرض بن چکا ہے۔ موت اور زندگی کا مسئلہ بن چکا ہے

اور اب طوعاً و کرہاً وہ لوگ بھی سوچنے اور غور کرنے پر مجبور ہوئے ہیں جن کے نزدیک بھی یہ ایک غیر اہم، غیر سنجیدہ اور غیر ادبی مسئلہ تھا۔ حالات کا جبر کہیے یا زندگی کی مجبوری، بہر حال ضرورت آن پڑی ہے کہ اس سنگین مسئلے پر نئے سرے سے سوچا جائے اور تمام چھوٹے چھوٹے تعصبات سے بالاتر ہو کر وطن کی اس تہ تک پہنچا جائے جو اندر سے اس یکجہتی کو بگاڑنے اور بگڑنے ہوئے ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ تفریق ہی کیوں؟ تعصب کا یہ تیر چلا ہی کیوں؟ اور اگر چلا تو ٹھیک نشانے پر کیوں بیٹھا اور ہمارے خیر سگالی کے ایک سے ایک قیمتی اور مخلص وار کیوں خالی جا رہے ہیں۔ کہیں میں نے کسی اخبار یا میگزین میں پڑھا تھا کہ بیسویں صدی کی ابتدا میں بریلی ڈویژن کے انگریز کمشنر کو دہلی کے ایک انگریز حاکم نے ایک خطیر رقم اس لیے دی کہ وہ اس ڈویژن کے ہندو مسلمان کے درمیان نفاق و فساد کروا دے۔ کمشنر نے پوری سازش کے ساتھ اس رقم اور مشنری کا استعمال کیا لیکن فساد نہ کروا سکا۔ آج ہماری حکومت لاکھوں کروڑوں روپے یکجہتی پر خرچ کر رہی ہے پھر بھی ناکام ہے۔ اسی مرادآباد ڈویژن میں سور جیسا حقیر جانور عین نماز عید کے وقت سیکڑوں ہزاروں انسانوں کی جان سے کھیل جاتا ہے، کیا یہ محض اتفاق ہے یا اس کے پیچھے فرقہ پرست عناصر اور سرمایہ دارانہ نظام کا ایک ناقص ڈھانچہ اور ارباب حکومت کا غیر انسانی و انتقامی رویہ کام کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ قومی یکجہتی کوئی ایسا کل پرزہ نہیں جس کو کسی ماہر مکینک کے ذریعے ٹھیک کرایا جاسکے، کوئی ایسی مشنری نہیں کہ جس کو بدلا جاسکے۔ قومی یکجہتی کا مسئلہ براہ راست قوم اور قومی شعور سے ہے۔ پروفیسر محمد حسن نے اس سلسلے میں ایک مضمون لکھا جس میں کہا کہ "قومی یکجہتی کا تصور معیشت میں صنعتی انقلاب، سیاست میں جمہوریت اور اقتصادیات میں سرمایہ کے عروج کا مرہون منت ہے"۔ جب تک کسی ملک کی سوئی ہوئی جاگیردارانہ معیشت اپنے پرانے کاٹ کباڑ سے آزاد ہو کر صنعتی ترقی کے راستے پر گامزن نہیں ہوتی اس وقت تک قومی یکجہتی کے تصورات کا رائج ہونا بے حد مشکل ہے۔ جو قوم مل جل کر اپنے تجارتی اور صنعتی راہ پر آگے بڑھے گی، تفریق اور فرقہ واریت کوسوں دور ہوتی جائے گی۔ اس سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ قومی یکجہتی ایک اخلاقی قدر سے زیادہ اقتصادی اور سیاسی ضرورت ہوتی ہے۔

ہندوستان میں اقتصادی اور صنعتی ترقی کی رفتار عجیب و غریب رہی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ انگریزوں کی آمد سے قبل ہندوستان محض کھیتی باڑی کا ملک نہیں تھا بلکہ صنعتیں قائم ہو چکی تھیں لیکن عام خیال یہ ہے کہ انگریزوں کی آمد کے بعد سے ہندوستان صنعتی انقلاب سے دوچار ہوا۔ اس سلسلے میں جن کی نگاہیں باریک ہیں اور جنھوں نے انگریزوں کے سازشی ذہن کو قریب سے دیکھا ہے اور سمجھا ہے ان کا کہنا ہے کہ برطانیہ خود ایک ترقی یافتہ ملک رہا ہے اور اپنی اقتصادی مصلحتوں کے پیش نظر ہندوستان میں برطانیہ کی دین صرف اتنی رہی کہ ضرورت کی حد تک اس نے صنعتی ترقیوں سے متعارف کرایا وہ بھی اس لیے تاکہ یورپ کی چیزوں کا استعمال اس کی ضرورت بن جائے اور ہندوستان کی صنعت پر اس کا قبضہ رہے۔ جاگیردارانہ نظام کو آنچ دیے بغیر صرف کہیں کہیں ترقی کے ایسے جلوے دکھائی دے جائیں، جس سے ہندوستانی عوام انگریزوں کے احسان مند رہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہ بات بظاہر معمولی لگتی ہے لیکن ماہرین سماجیات و اقتصادیات اس کے یہ معنی نکالتے ہیں کہ صنعتی انقلاب سے عوام کی جو وابستگی اور بیداری ہوتی ہے اور قومی شعور جاگتا ہے ہندوستانی عوام کا وہ شعور جاگ نہیں پایا یا جاگنے نہیں دیا گیا۔ ہندوستانی عوام کا وہ شعور خانوں میں تقسیم رہا یا جاگیردارانہ صندوقوں میں بند رہا۔ ان صندوقوں کے کچھ ڈھکن اس وقت کھلے جب ہندوستان نے باقاعدہ آزادی کی جنگ لڑی۔ ایک بڑے قومی اور سماجی مقصد کے لیے ہندوستانی عوام کچھ دنوں کے لیے ایک قوم اور ایک جھنڈے تلے یکجا ہو سکے۔ ایک مشترکہ مقصد کے لیے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونے کے لیے مجبور تو ہوئے لیکن آج آپ اسے جنگ آمد بہ جنگ آمد کا نام دے سکتے ہیں۔ یا ایک وقتی سمجھوتہ جس کی مثالیں خلافت تحریک سے لے کر کانگریس کے سمجھوتے تک پیش کی جا سکتی ہے یہی وجہ ہے کہ جیسی ہی آزادی آئی اپنے دامن میں مذہبی، تہذیبی اور لسانی گروہ ساتھ لائی اور ساتھ ہی کشمکش اور خونریزی بھی جس کا سلسلہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔

آزادی کے بعد یہ خیال کیا جاتا تھا کہ آزاد ہندوستان میں ایک قوم اور ایک قومی شعور کا تصور پیدا ہو جائے گا۔ جس ملک میں متعدد تہذیبیں ہوں اور بے شمار زبانیں بولی جاتی ہوں بہ ظاہر وہاں کسی قوم یا زبان کا رائج ہونا مشکل یا ناممکن سا نظر آتا ہے لیکن یہ ناممکن سا تصور ممکنہ حدوں میں دوسرے ملکوں میں بہر حال پایا جاتا ہے۔ مغرب میں بھی خاصی زبانیں اور تہذیبیں ہیں اور ان کے درمیان اختلافات بھی ہیں لیکن مخاصمت نہیں، نفرت اور انتقام نہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ وہاں کے عوام اپنے ملک اور معاشرے کے تئیں اس قدر بیدار اور باشعور ہیں کہ ان کے نزدیک یہ مسائل اتنے اہم نہیں جتنے کہ اقتصادی اور معاشی ہوتے ہیں۔ ہمارے یہاں تو صورت مختلف رہی، ہم تو حقیقتاً اس وقت بھی ایک نہیں ہو سکے جب ہم بہ ظاہر ایک ہو کر آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ پروفیسر بپن چندرا نے اس ضمن میں بڑی اچھی بات لکھی ہے:

"اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہندوستان کے ایک ملک اور ایک قوم بننے کا تشکیلی عمل بہ یک وقت ایک تفریقی عمل بھی تھا۔ اس نے قوم کو مختلف طبقوں میں بانٹ دیا جیسے جیسے عوام کے دلوں میں ایکتا کا جذبہ اور ایک ہونے کا احساس فطری عوامل کے تحت نہیں پیدا ہوا تھا اور نہ ہی ہندوستانی عوام نے کسی معروضی حقیقت پسندی کے تحت اپنے آپ کو ایک قوم تصور کرایا تھا بلکہ اس کے پیچھے ایک نہایت پیچیدہ اور وقت طلب عمل خود شناسی کا کارفرما تھا"۔

اور یہ خود شناسی اوپر سے نیچے تک تھی تبھی تو ایک زمانے میں "Unity from the top" کا نعرہ بلند ہوا، کانگریس بہ ظاہر اتفاق کی کوششیں کرتی رہی لیکن اندر ہی اندر بے شمار مصلحتوں کا شکار بھی ہوتی رہی اور خود شناسی کا یہ عمل ذات سے کر مذہب، زبان، علاقہ وغیرہ کی شکل میں چھپ کر مشتعل لیڈروں کے دل و دماغ میں اپنی جگہ بناتا چلا گیا۔ خود شناسی کے اس عمل میں جب سیاسی اور اقتصادی سامراجیت نے اپنا اثر دکھایا تو سب سے بڑی ضرب قومی شعور کو لگی اور پھر اس نازک آئینے پر وہ بال ہی بال پڑتی ہی چلی گئیں اور شیشۂ قوم چور چور ہو کر بکھر گیا اور آزاد و جمہوری ہندوستان محض زبان، تہذیب کی سطح پر ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا اور قومی شعور رخصت ہو گیا۔ فطری طور پر اپنا اپنی قوم، زبان اور علاقے سے متعلق نقصان دہ جذبہ بیدار ہوا۔ زبان سے متعلق میں تھوڑی سی عرض کرنا چاہوں گا۔ (باقی آئندہ)

یاد رفتگاں

اردو ادب و صحافت کا معروف نام

اختر شیرانی مرحوم

سید طلحہ نقشبندی القادری
کتب خانہ خانقاہ نقشبندیہ،
بالاپور، ضلع آکولہ، مہاراشٹر

ایک جگہ آغا حشر کاشمیری مرحوم نے یہ شعر کہا تھا:

کوئی ہوتے کیوں ہے اس قدر فردوس میں نازاں
ہزاروں جلوے آباد ہے گلشن اختر میں

مذکورہ بالا شعر میں ایک ایسی حقیقت پوشیدہ ہے جس کی وجہ سے یہ شعر غیر فانی بن گیا ہے۔ کون ہے جو گلشن اختر سے منکر ہے۔ اختر سے مراد واجد علی شاہ اختر نہیں بلکہ دنیائے اردو کے ممتاز شاعر اختر شیرانی ہیں، جن کی بابت مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے ایک جگہ تحریر کیا تھا: "آپ کی بے مثال نظم سے زیادہ آپ کی بے نظیر نثر نے مجھے متاثر کیا ہے"۔ مذکورہ بالا نقل و قول اس خط کا ہی جزو ہے جو رسالہ 'خیالستان' کی زینت بن چکا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں مرحوم کا یہ مشہور مصرع:

کوئی نقاش ہو یا کوئی عکاس

ان کے اس فرضی نام کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کے پردے میں اختر شیرانی مرحوم مضمون نگاری کرتے تھے۔ 'نقاش' خود مولانا ظفر علی خاں مرحوم تھے اور 'عکاس' سے مراد اختر شیرانی مرحوم تھے جو خامہ ابن البطوطہ ایں جہانی کی آڑ لے کر اردو زبان و ادب کی خدمت انجام دیتے رہے۔

شاعر رومان اختر شیرانی، ۴ مئی ۱۹۰۵ء مطابق ۲۸ ربیع الاول ۱۳۲۳ھ ٹونک ریاست راجستھان میں پیدا ہوئے۔ آپ کا اصلی نام محمد داؤد خان ہے، لیکن دنیائے علم و ادب و شاعری میں اختر شیرانی کے نام سے معروف ہوئے۔ آپ کے والد ماجد حافظ محمود خاں شیرانی مرحوم اردو زبان کے بہت بڑے محقق، عالم اور اورینٹل کالج لاہور میں پروفیسر تھے۔ زمانہ طفلی اختر نے آغوش مادر میں گزارے مگر جب ذرا ہوش سنبھالا تو مسلمانوں کے اور بچوں کی طرح انھیں بھی عربی مدرسے میں داخل کیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں نواب ابراہیم علی خاں نے ریاست ٹونک سے کچھ لوگوں کو جلا وطن کرنا شروع کر دیا تھا۔ حافظ محمود خاں شیرانی بھی اسی زد میں آ گئے اور وہ جودھپور کی صحرائی حویلی 'قصر صحرا' میں جا کر مقیم ہوئے۔ بعد ازاں اختر شیرانی مع والدہ ماجدہ کے وہاں پہنچے، اس طرح ان کا تمام تعلیمی سلسلہ ختم ہو گیا۔ حافظ صاحب مرحوم کو اپنے لخت جگر کی یوں تباہی و بربادی دیکھی نہ گئی اس لیے انھوں نے یہ مصمم ارادہ کیا کہ وہ اختر شیرانی کو لاہور لے جا کر اورینٹل کالج لاہور میں تعلیم دلائیں

گے۔ چند ماہ کے بعد ہی وہ انھیں لاہور لے گئے اور سب سے پہلے محمود خاں مرحوم نے اپنے استاد محترم مولوی محمد دین مختار (پروفیسر فارسی اورینٹل کالج لاہور) کی خدمت میں اختر شیرانی کو پیش کیا اور بعدہ علامہ اقبال مرحوم، سر عبدالقادر مرحوم، مرزا محمد شفیع دہلوی مرحوم، شیخ عبدالعزیز مرحوم اور شجاع الدین مرحوم سے روشناس کرایا۔

اورینٹل کالج لاہور میں داخل ہو کر اختر شیرانی مرحوم کو اپنی خداداد قابلیت و ذہانت دکھانے کا موقع ملا، چناں چہ ۱۹۲۱ میں انھوں نے ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا، مگر اختر شیرانی کے ماحول اور میلان طبع نے انھیں ہائی اسکول کا امتحان بھی پاس کرنے نہیں دیا اور وہ امتحان سے چند ماہ قبل وہاں سے فرار ہو گئے۔ تعلیم کے زمانے ہی میں اختر شیرانی نے چند غزلیں بہ غرض اصلاح علامہ تاجور مرحوم (ایڈیٹر مخزن) کو دکھائی تھیں۔ اس طرح یہ دونوں ایک دوسرے سے روشناس ہو چکے تھے۔ میاں بشیر احمد جب سوئزرلینڈ جانے لگے تو چند ماہ کے لیے ادبی مجلہ 'ہمایوں' کی ادارت اختر شیرانی کے سپرد کر گئے۔ ۱۹۲۵ میں مولوی غلام رسول مرحوم نے ایک رسالہ نکالا تھا اور اس کا نام 'انتخاب' رکھا تھا، اس کی ادارت بھی اختر شیرانی کے ذمے آئی لیکن کچھ ان بن کی بنا پر یہ رسالہ بعد میں جاری نہ رہ سکا، بعدہ 'بہارستان' عالم وجود میں آیا۔

اس زمانے میں مولانا محمد علی جوہر مرحوم کا 'ہمدرد' شباب پر تھا۔ مولانا نے بھی اختر شیرانی کے زور قلم اور قوت تحریر کا اندازہ لگا کر اختر شیرانی کو لکھا کہ وہ ہر ہفتہ 'ہمدرد' کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور لکھا کریں۔ چناں چہ 'نکات و معارف' کے عنوان سے انھوں نے 'ہمدرد' کے لیے کالم لکھے۔ پھر ۱۹۲۸ میں اختر نے اپنا پرچہ 'خیالستان' جاری کیا مگر یہ کارکنان کی بدنیتی کی نذر ہو گیا۔ ۱۹۳۱ میں 'رومان' کو اردو دنیا سے متعارف کرایا، لیکن اس کا بھی 'خیالستان' کا سا حشر ہوا۔ ۱۹۳۱ میں 'شاہکار' کی ادارت آپ نے سنبھالی مگر چند وجوہ کی بنا پر انھیں اس سے علاحدہ ہونا پڑا۔

رسائل اور مجلے نکالنا، مضامین لکھنا اور ان کو شائع کرنا بھی زبان و ادب کی ایک خدمت ہے، مگر بعض اصحاب صرف تصنیف و تالیف اور شعری مجموعوں کی اشاعت کو ہی اردو کی خدمت گردانتے ہیں۔ اگر اس نظریے سے بھی اختر شیرانی کی ادبی و صحافتی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی تمام زندگی اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کے لیے وقف کر دی۔ 'مجمع سعدین' و 'مجمع بحرین' کی تدوین میں جسے خان بہادر مولوی محمد شفیع مرحوم نے مرتب کی تھی، اختر شیرانی کا بھی اس میں ہاتھ رہا۔ اس کے علاوہ 'جامع اللغات' کی ادارت بھی انھوں نے ہی کی۔ ڈاکٹر علامہ اقبال مرحوم نے جو فارسی نصاب کی کتابیں مرتب فرمائی تھیں ان کی تدوین میں بہ طور مددگار آپ نے بھی کام کیا تھا۔ اختر مرحوم چوں کہ فن خطاطی کے ماہر تھے اس وجہ سے علامہ اقبال کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کو نقل کرنے کی خدمت آپ ہی کے سپرد ہوئی۔ ان تمام مشغلوں اور کارناموں کے باوجود آپ نے شعر و شاعری، تصنیف و تالیف اور رسائل اور مجلوں کی ادارت برابر جاری رکھی۔ ہم یہاں اختر شیرانی کی تصانیف و تالیف اور تراجم کی فہرست قارئین کی دل چسپی کے لیے پیش کر رہے ہیں:

۱- 'ضحاک': یہ ایک ترکی ڈرامے کا ترجمہ ہے۔ آپ نے یہ ترجمہ نہایت سلیس زبان میں اور بڑے عمدہ طریقے سے کیا ہے۔
۲- 'پھولوں کے گیت': بچوں کے لیے نظمیں، عام بول چال کی زبان میں اور بچوں کی سمجھ میں آنے والی نظمیں اس میں موجود ہیں۔
۳- 'آئینہ خانے میں': پانچ فلمی افسانے جو کہ آپ نے ایک ہی رات میں لکھے تھے۔
۴- 'نغمۂ حرم': خواتین کے لیے نظمیں۔
۵- 'صبح بہار': نظموں اور کچھ غزلوں کا مجموعہ۔
۶- 'اختر ستان': نظموں کا دوسرا مقبول مجموعہ۔
۷- 'لالۂ طور': نظموں کا تیسرا مجموعہ۔
۸- 'طیور آوارہ': نظموں اور گیتوں کا مجموعہ۔
۹- 'دھڑکتے دل': افسانوں کا مجموعہ۔
۱۰- 'جوامع الحکایات': دو جلدوں میں محمد عوفی کی کتاب کا لاجواب ترجمہ اور خلاصہ ہے۔
۱۱- 'شہناز': غزلوں اور نظموں کا مجموعہ۔

اختر شیرانی مرحوم کو دنیائے اردو ادب نے ایک ممتاز نثر نگار اور شاعر دونوں حیثیتوں میں پہچانا ہے۔ انھیں اردو کی مختلف اصناف ادب پر مکمل عبور حاصل ہے۔ الفاظ، فقرے اور جملے ان کے پابند نظر آتے ہیں۔ وہ سادہ اور رنگین صرف رنگین ہی نہیں بلکہ دقیق رنگین عبارت بھی تحریر کرتے ہیں۔ اگر ان کی سحر نگاری اور سہل نگاری کے نمونے دیکھنے ہوں تو 'دھڑکتے دل' اور 'آئینہ خانہ' میں آسان اور عام فہم زبان موجود ہے۔ ان کا دوسرا انداز تحریر وہ ہے جس میں فارسی کا غلبہ ہے آمد کم اور تصنع زیادہ ہے۔ تمثیلات، استعارات و تشبیہات کا استعمال بھی موجود ہے۔ اس کی ایک مثال ہم یہاں پیش کر رہے ہیں، ملاحظہ ہو:

''اکبر اردو کا وہ تنہا شاعر ہے جو ایک ہی وقت میں شاعر بھی تھا اور مصلح قوم بھی، بذلہ سنج ظریف بھی تھا اور حکیم امت بھی، قومی رہنما بھی تھا اور ملک کا ضرورت شناس مفکر بھی، حالی بھی تھا اور انشا بھی، طنز نگار بھی تھا اور غزل گو بھی''۔

حالی اگر جدید شاعری کے اولین علم بردار تھے تو اکبر جامعیت کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ دونوں کی شاعری کی روح ایک ہے مگر انداز مختلف ہے۔ شراب ایک ہے مگر رنگ و ساغر الگ الگ۔ جس مقصد پر حالی کی نگاہ غم و یاس میں ڈوبی ہوئی پڑتی ہے۔ اکبر کی فکر ظریف اسے مسکرا کر دیکھنے کی عادی ہے۔ حالی کی طرح بلکہ ان سے بھی کچھ زیادہ اکبر ایک سچے مشرقی تھے اور شاعری کے نقطۂ نظر کا جو پھیلاؤ اکبر کے یہاں نظر آتا ہے وہ اب تک بدستور قائم ہے۔

اختر شیرانی مرحوم نے بچوں کے لیے انتہائی عام فہم زبان میں نظمیں لکھی ہیں۔ جذبات ضرور جواں شاعر کے ہیں مگر ان میں بچپن اور لڑکپن کی روح ڈالی گئی اور ان میں وہ ایسی موسیقیت اور ایسا ترنم پیدا کر دیتے ہیں کہ بچوں کے دل میں اتر جائے۔ بچے کیا جوان اور بڑے بوڑھے بھی وجد کرنے لگتے ہیں:

آیا ساون کا مہینہ نظر آیا جھولا
دل کو بھایا مری آنکھوں میں سمایا جھولا

باغ کی بہار دیکھ کر بچے بھی تڑپ اٹھتے ہیں:

باغوں کی بہار کوئی دیکھے
پھولوں کا سنگار کوئی دیکھے
پھولوں میں بسی ہوئی فضا ہے
خوشبو سے لدی ہوئی ہوا ہے
چڑیاں خوش ہیں چہک رہی ہیں
کلیاں کیسی مہک رہی ہیں
باغوں میں بہار آرہی ہے
ہر شے پر خوشی سی چھا رہی ہے

بچوں میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شامل ہوتے ہیں۔ اختر شیرانی بھلا لڑکیوں کو کیسے نظر انداز کر سکتے ہیں:

جہاں ہم اپنے پیاروں سے گلا کی گھر سے آتی ہیں
ہوا کی گود میں نیلم کی پریاں مسکراتی ہیں
اور اپنے نیلگوں ہونٹوں سے ہولے سے اٹھاتی ہیں
وہاں میں ہوں مری ہم جولیاں ہوں ہم ہوں جھولا ہوں

اختر شیرانی مرحوم نے ان سے بھی زیادہ کامیاب نظمیں خواتین کے لیے لکھی ہیں۔ انھوں نے شعری مجموعہ 'نغمۂ حرم' ان کے لیے ہی مخصوص کر دیا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے 'جوگن ماں'، 'جھولا'، 'ساون کی گھٹا'، 'اندھی لڑکی' وغیرہ یہ سب خواتین سے متعلق ہیں۔ ان میں اختر شیرانی نے عورتوں کے حقوق کی وکالت بھی کی ہے۔ اختر شیرانی نے شاعری میں اپنے جذبات اور احساسات کے چراغ روشن کیے۔ شاعر جذبۂ دل سے مجبور ہو کر یوں پکار اٹھتا ہے:

محبت کے لیے ہوں میں دنیا کی محفل میں
محبت خون بن کے لہلہاتی ہے میرے دل میں
محبت ابتدا میری محبت انتہا میری
محبت سے عبادت ہے، بقا میری فنا میری
محبت آرزو میری محبت جستجو میری
محبت خامشی میری محبت گفتگو میری

یہ محبت اختر شیرانی میں موجود ضرور ہے، مگر اس کا رجحان غیر فطری نہیں ہے، وہ 'سلمیٰ' سے محبت کرتا ہے مگر ناکام رہتا ہے پھر بھی یہی کہتا ہے:

محبت ہی مری طاقت محبت ہی جوانی ہے
محبت گر نہ ہو ویران میری زندگانی ہے

اس محبت میں ابتذال کا عنصر بہت کم ہے۔ اختر شیرانی یاس و حزن کے باوجود حقائق روزگار سے بھی غافل نہیں رہتے:

کسی کا حال دنیا میں کبھی یکساں نہیں رہتا
یہاں دیکھو تغیر ہی تغیر کی حکومت ہے
تغیر اصل ہستی ہے تغیر اصل فطرت ہے
تغیر جس میں انساں میں وہ انساں نہیں رہتا

جہاں تک انداز بیان اور طرز شاعرانہ کا تعلق ہے تو انھیں زبان و بیان پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔ زندگی کی ایک اہم بات کو تشبیہ کے پردے میں اختر شیرانی مرحوم نے یوں کہا ہے:

شبستان جوانی کا تو ایک زندہ ستارہ ہے
تو اس دنیا میں بحر حسن فطرت کا کنارہ ہے

سلمیٰ کی دل کشی اور جاذبیت اختر شیرانی مرحوم کے کلام کا جزو اعظم ہے، مگر یہاں تلمیحات سے کام لیا ہے۔ عامیانہ روش سے بھی گریز کرنے کی کاوش کی ہے:

میں فضائے عرش کا ٹوٹا ہوا سیارہ تھی
جلوہ ہائے نور میں مائل نظارہ تھی
آتش نمرود تھی جب آسماں تک شعلہ زن
خلد بن کر تب میں ابراہیم کا گہوارہ تھی
دیدۂ یعقوب میں تھی جلوۂ امید میں
نوح کی کشتی میں حسن چارۂ بے چارہ تھی

اختر شیرانی مرحوم کی آخری ایام میں لکھی گئی غزل کے چند اشعار پڑھیے اور کلام کی بلندی اور تشبیہات کا مطالعہ کیجیے:

تمھیں ستاروں نے بے اختیار دیکھا ہے
شریر چاند نے بھی بار بار دیکھا ہے
بہار صبح کی رنگینیوں میں کھوئے ہوئے
نسیم نے تمھیں مستانہ وار دیکھا ہے
جب پانی میں چاندی سے پاؤں لٹکائے
شفق نے تم کو سر جوئبار دیکھا ہے
ہمیشہ رات کو محو مطالعہ تم کو
نگاہ شمع نے پروانہ وار دیکھا ہے
کسی خیال میں کھوئے ہوئے ہمیشہ تمھیں
سحر نے ہمدم گل و شاخسار دیکھا ہے
نسیم باغ نے زیب انتساب سمجھ کے بھی
تمھیں بہ گل کدۂ شاد بار دیکھا ہے
مگر مری نگہ شوق کو شکایت ہے
کہ اس نے تم کو فقط ایک بار دیکھا ہے

اختر شیرانی مرحوم ایک رومانی شاعر تھے۔ جدید اردو ادب میں ان کی اہمیت اور خدمات مسلّم ہیں۔ 43 سال کی عمر میں لاہور میں ۱۹۴۸ میں رحلت پائی:

کسی مغرور کے آگے ہمارا سر نہیں جھکتا
فقیری میں بھی اختر غیرت شاہانہ رکھتے ہیں

•••

اردو دُنیا

ادیب اور منشی، ہائی اسکول کے مساوی

الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ کا تاریخ ساز فیصلہ

لکھنؤ (۱۶ دسمبر)۔ اردو اساتذہ کی تقرری عمل میں ٹی ای ٹی پاس جامعہ اردو اور اتر پردیش مدرسہ تعلیمی بورڈ کے سند یافتگان کو بھی مساوی تسلیم کرتے ہوئے پورا موقع دیا جائے۔ اس عمل میں جامعہ اردو کے ادیب اور مدرسہ تعلیمی بورڈ کے منشی سند یافتگان کو بھی ہائی اسکول کے مساوی تسلیم کرتے ہوئے شامل کیا جائے۔ یہ فیصلہ معلم اردو ویلفیئر ایسوسی ایشن کے ریاستی صدر محمد تسیم (انانو) اور دیگر کی عرضی پر الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ نے دیا۔ جسٹس شبیہ الحسنین کی بنچ نے پٹیشن نمبر ایم ایس 2013/7103 کی سماعت کرتے ہوئے حکم دیا کہ جامعہ اردو علی گڑھ کے امتحان 'ادیب' اور اتر پردیش مدرسہ تعلیمی بورڈ (لکھنؤ) کے امتحان 'منشی' کو ہائی اسکول کے مساوی تسلیم کیا جائے۔ انھوں نے ان سند یافتگان کو اردو اساتذہ کی تقرری عمل میں شامل کرنے کا بھی حکم دیا۔ واضح رہے کہ تنظیم نے یہ درخواست گزشتہ ۲۵ راکتوبر کو الہ آباد ہائی کورٹ کی لکھنؤ بنچ میں اپنے وکیل پی ایس باجپئی کے توسط سے دی تھی۔ اس پر چار بار سماعت ہوئی جس میں سرکاری وکیل کے بطور جیوتی سنہا اور سی بی سنگھ موجود رہے۔ فریقین کے دلائل سننے کے بعد آج سنگل بنچ نے یہ فیصلہ دیا۔ فاضل جسٹس نے اپنے فیصلے میں کہا کہ جن امیدواروں کی کونسلنگ ہو چکی ہے انھیں فوراً منتخب فہرست میں شامل کرتے ہوئے تقرری نامہ دیا جائے اور جن امیدواروں کی کونسلنگ نہیں ہوئی ہے انھیں کونسلنگ کے لیے بلایا جائے۔

تنظیم کے جنرل سکریٹری ایم آئی ہاشم بارہ بنکوی نے فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے تمام سند یافتگان کو مبارک باد پیش کی نیز کامیابی پر اس توقع کا اظہار کیا ہے کہ تمام ٹی ای ٹی پاس سند یافتگان کی تقرری جلد ہی ہو جائے گی۔ تنظیم کے ترجمان ڈاکٹر محمد راشد نے بتایا کہ تنظیم اس بات کو تسلیم کرانے کے لیے برسوں سے کوشاں تھی جس میں بڑی کامیابی ملی ہے۔ اس سے قبل متعدد اردو تنظیموں نے حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اردو اساتذہ کی تقرری میں جامعہ اردو کے امتحانات ادیب اور منشی کو بھی حسب سابق ہائی اسکول کے مساوی تسلیم کرتے ہوئے انھیں بھی موقع دے جس طرح سابق وزیر اعلا ملائم سنگھ یادو کے دور اقتدار میں کیا گیا تھا۔ اس سلسلے میں تنظیموں نے موجودہ وزیر اعلا سے بھی ملاقات کی تھی اور انھوں نے یقین دہانی کرائی تھی کہ مثل سابق اردو اساتذہ کی تقرری کرائی جائے گی۔ حکومت کی منشا کے باوجود افسران اس معاملے کو التوا میں ڈالے رہے تھے جب کہ اردو تنظیموں نے متعدد مرتبہ اپنا موقف افسران کے سامنے رکھا لیکن افسران نے اس جانب کوئی خاص توجہ نہیں دی جس سے وقت نکلا جا رہا تھا اور اساتذہ کو یہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا کہ ٹی ای ٹی پاس کرنے کے بعد بھی کہیں وہ تقرری سے محروم نہ رہ جائیں۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

سول سروسز کے امتحان سے فارسی و عربی کو ہٹانے پر طلبہ کا احتجاج

متو ناتھ بھنجن (۱۵ دسمبر)۔ طالب علم لیڈر محمد عارف انصاری نے کہا کہ یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں اختیاری مضامین کی فہرست سے عربی اور فارسی زبان کا اخراج ہندوستانی اکائیوں کو کمزور کرنے کی سازش ہے۔ اس طرح کا فیصلہ اقلیتی طلبہ و طالبات کو سول سروسز سے دور رکھنے کے لیے کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر حکومت اپنا فیصلہ نہیں بدلتی تو طلبہ اور طالبات بڑے پیمانے پر احتجاجی مظاہرہ کرنے پر مجبور ہوں گے۔ [illegible] نے کہا کہ عربی اور فارسی زبان کلاسیکل زبان کی حیثیت رکھتی ہیں ان دونوں زبانوں کو ملک کی بیس سے زیادہ یونیورسٹیوں کے علاوہ بہت سے ڈگری کالجوں اور مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان زبانوں کو یونین پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں بلا تاخیر شامل کیا جائے۔ اس موقع پر محمد اشرف، محمد عمر، ابرار احمد، کاشف جمال، وسیم، ارشد بشر، محمد صادق، محمد عامر، فاروق عمر، زاہد، محمد شاہد، فرزانہ پروین، تبسم پروین، حنا پروین، سلمیٰ خاتون، شبانہ خاتون، فرحت پروین، دلشاد، محمد اظہر، جاوید، محمد دانش وغیرہ طلبہ اور طالبات موجود تھے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

جموں و کشمیر کے اسکولوں میں اردو اساتذہ کی کمی باعث تشویش

جموں (۱۷ دسمبر)۔ جموں و کشمیر ریاستی کانگریس کمیٹی نے ریاست کے سرکاری اور پرائیویٹ اسکولوں میں اردو اساتذہ کی کمی پر تشویش کا اظہار کیا ہے۔ کمیٹی کے نائب صدر ہری سنگھ نے یہاں جاری ایک بیان میں کہا کہ یہ بات موجب تشویش ہے کہ کئی علاقوں خاص کر جموں، سامبا اور کٹھوعہ وغیرہ اضلاع کے سرکاری اور پرائیویٹ اسکولوں میں اردو اساتذہ کا فقدان ہے۔ ضلع سامبا کے ریا، بجلی اور برودی مواضع کے دورے کے بعد انھوں نے کہا کہ لوگوں نے مجھے اپنی پریشانیوں سے واقف کرایا نیز ان لوگوں نے علاقے کے تمام اسکولوں میں اردو کو لازمی سبجیکٹ قرار دینے اور اردو اساتذہ کی تعیناتی کا مطالبہ کیا۔ ہری سنگھ نے کہا کہ ریاست جموں و کشمیر کی سرکاری زبان ہونے کی وجہ سے ہر شخص کو اردو سے واقفیت ہونی چاہیے۔ انھوں نے حکومت سے اسکولوں میں اردو ٹیچنگ فیکلٹی کی تشکیل کی اپیل کی۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

اردو اساتذہ کی تقرری میں سست روی کے سبب معلم اردو سند یافتگان پریشان

پیلی بھیت (۹ دسمبر)۔ پارلیمانی انتخابات کا وقت جیسے جیسے قریب آ رہا ہے معلم اردو سند یافتگان کی دھڑکنوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ وجہ بالکل صاف ہے معلم اردو سند یافتگان کی دوبارہ کونسلنگ ہوتے ہوئے بھی چودہ دن گزر گئے لیکن ریاستی حکومت کی سست روی کی وجہ سے تقرری کا عمل پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ پایا ہے۔ اردو مضمون کی تقرری میں تاخیر کی وجہ سے معلمین اردو میں اضطراب کا ماحول ہے۔ اس کی وجہ صاف ہے کہ گزشتہ ۱۸ برس سے وہ اپنی تقرری کا انتظار کر رہے تھے۔ اب جب کہ موجودہ ریاستی حکومت نے ان کی تقرری کی کارروائی شروع کر کے ایک مثبت قدم اٹھایا تھا، اس سے کافی حد تک اردو مضمون ٹیچروں کو راحت ملی تھی اور ریاستی حکومت کے اس قدم کی ہر طرف ستائش بھی ہوئی تھی، مگر اب تک ایک بھی معلم اردو کی تقرری نہیں ہو سکی ہے۔

(انقلاب۔ دہلی)

محبوب نگر میں اقلیتی طالبات کے لیے جونیئر کالج کا قیام

آئندہ تعلیمی سال سے اردو اور انگریزی میڈیم میں داخلے متوقع

حیدرآباد (۱۳ دسمبر)۔ آئندہ تعلیمی سال سے محبوب نگر میں طالبات کے لیے اردو اور انگریزی میڈیم جونیئر کالج کے قیام کے سلسلے میں ریاستی اقلیتی کمیشن کی سفارش پر کمشنر اقلیتی بہبود جناب شیخ محمد اقبال نے اقدام کرتے ہوئے جونیئر کالج کے قیام کی کارروائی شروع کر دی ہے۔ صدر ریاستی اقلیتی کمیشن جناب محمد عابد رسول خاں نے بتایا کہ اقلیتی کمیشن کو محبوب نگر میں اقلیتی طالبات کے لیے اردو اور انگریزی میڈیم کے قیام کے لیے کئی نمائندگیاں موصول ہوئیں جس پر کمیشن نے سفارش کی اور کمشنر اقلیتی بہبود نے بروقت اقدام کرتے ہوئے اس کی منظوری دے دی۔

(اعتماد۔ حیدرآباد)

شمالی دیناجپور میں اردو دوسری سرکاری زبان

مگر 'آشاؤں' کی بحالی میں بنگلہ لازمی

کوال پوکھر، مغربی بنگال (۹ دسمبر)۔ شمالی دیناجپور ضلع کا اسلام پور سب ڈویژن اردو اکثریتی علاقہ ہے اور فی الحال برسر اقتدار جماعت نے اسلام پور میں بھی اردو کو دوسری سرکاری زبان کا باضابطہ درجہ دیا ہے اس کے باوجود پچھلے دنوں ریاستی سطح پر وزارت صحت نے شمالی دیناجپور میں 'آشاؤں' کی بحالی کے لیے بنگلہ لکھنا، پڑھنا اور بولنا لازمی قرار دیا ہے جب کہ ریاست کے دیگر اضلاع کے لیے یہ شرط لازمی قرار نہیں دی گئی ہے۔ بنگلہ زبان کی شرط صرف اور صرف شمالی دیناجپور کے لیے ہے اس کا سیدھا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چوں کہ اسلام پور سب ڈویژن ضلع شمالی دیناجپور کے ماتحت ہے اور یہاں کی اکثریت اردو بولتی، لکھتی اور پڑھتی ہے۔ جانکاروں کے مطابق یہی وجہ ہے کہ محکمۂ وزارت صحت نے شمالی دیناجپور میں بنگلہ لکھنا، پڑھنا اور بولنا لازمی شرط قرار دیا ہے۔ اگر بنگلہ لکھنا، پڑھنا اور بولنا پوری ریاست مغربی بنگال کے لیے لازمی ہوتا تو یہ شرط تمام اضلاع کے لیے لازمی قرار دیا جاتا لیکن ایسا صرف شمالی دیناجپور کے لیے ہی کیا گیا ہے۔ ایسا کیوں؟ جانکاروں نے نمائندہ سے کہا کہ بنگلہ لکھنا، پڑھنا، بولنا شمالی دیناجپور کے لیے اس لیے لازمی کیا گیا ہے کہ اس ضلع کی اردو آبادی کو آشاؤں کی بحالی سے دور رکھا جائے۔ جانکاروں نے یہ بھی کہا کہ وزارت کا قلمدان ممتا بنرجی کے پاس ہے اور وہ اپنے آپ کو اردو زبان کا شیدائی کہتی ہیں۔ شمالی دیناجپور ہیلتھ کمیٹی کے چیئرمین چودھری عبدالکریم ہیں جن کی مادری زبان اردو بتائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کمیٹی میں مائناریٹی کمیشن کا نمائندہ بھی شامل ہے۔ متذکرہ تینوں سرکردہ اعلا قیادت کی موجودگی میں شمالی دیناجپور کے لیے ہی بنگلہ لکھنے، پڑھنے اور بولنے کی شرط لگا؟ کیا یہ کسی سازش کا حصہ ہے؟

(آبشار۔ کلکتہ)

شمس آباد میں علاحدہ اردو میڈیم پرائمری اسکول کے احکام جاری

حیدرآباد (۱۰ دسمبر)۔ جناب محمد مشتاق محی الدین (صدر مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن شمس آباد منڈل رنگاریڈی) نے ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کے مختلف عہدیداروں بشمول ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر رنگاریڈی، مرکزی وزیر سائنس اینڈ ٹیکنالوجی جناب ایس جے پال ریڈی اور کانگریس کمیٹی آندھرا پردیش کے اقلیتی شعبے کے چیئرمین جناب محمد سراج الدین سے ایسوسی ایشن کی جانب سے تحریری نمائندگی کی تھی کہ اردو میڈیم پرائمری اسکول کو تلگو میڈیم مینجمنٹ سے اسی تعلیمی سال سے علاحدہ کرتے ہوئے ایک الگ ہیڈ ماسٹر فراہم کریں، کیوں کہ اردو میڈیم پرائمری اسکول شمس آباد کے تلگو میڈیم مینجمنٹ کے زیر

سرکاری محکموں، بینکوں اور دیگر اداروں کے سائن بورڈوں پر

اردو تحریر کرنے کی ترغیب کے حوصلہ افزا نتائج

حیدرآباد (۱۱ دسمبر)۔ انجمن ترقی اردو عظیم تر حیدرآباد کی جانب سے مختلف محکموں، بینکوں، ریلوے ڈپارٹمنٹ، تعلیمی اداروں، محکمۂ پولیس، محکمۂ حسب، رجسٹرار پاسپورٹ آفس سکندرآباد، محکمۂ بلدیہ، بس سروس، محکمۂ لائف انشورنس اور دیگر اداروں کو اپنے اپنے سائن بورڈوں پر انگریزی، تلگو اور ہندی زبانوں کے علاوہ اردو بھی تحریر کرنے کے لیے نمائندگی کی گئی تاکہ ریاست کی دوسری سرکاری زبان کو اس کا صحیح مقام حاصل ہو سکے۔ اس نمائندگی پر اسٹیٹ بینک آف انڈیا کی شاخ شمشیر گنج کے منیجر جناب عبدالمنان نے عمل کرتے ہوئے دو ہفتے کے اندر سائن بورڈ آویزاں کر دیا جس پر اردو بھی تحریر ہے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

میسور اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے اشتہارات

اردو اخبارات کے لیے جاری کرنے کی اپیل

میسور (۷ دسمبر)۔ میسور شہر کانگریس کے محکمۂ اقلیت کے سابق صدر اللہ بخش بخشی نے ایک اخباری بیان جاری کرتے ہوئے میسور کے حلقہ نرسمہا راجہ کے رکن اسمبلی تنویر سیٹھ اور میسور ضلع کے نگراں کار وزیر وی سری نواس پرساد سے اپیل کی ہے کہ میسور کے مختلف علاقوں میں گھروں اور دکانوں کے لیے سائٹوں کی نیلامی کی جاتی ہے، لیکن میسور اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی کی جانب سے صرف کنڑا اور انگریزی اخباروں میں اشتہار دیے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے اس کی اطلاع بروقت اردو داں طبقے تک نہیں پہنچ پاتی اور وہ سائٹوں کی نیلامی میں حصہ نہیں لے پاتے، اس لیے میسور اربن ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے ذمہ دار افسران اور کمشنر کو ہدایت جاری کرتے ہوئے اردو اخباروں کو بھی اشتہارات جاری کرنا چاہیے تاکہ ان سائٹوں کی نیلامی کی اطلاع اردو داں طبقے تک بھی پہنچ سکے۔ حال ہی میں مختلف زبانوں کے اخباروں میں حلقہ نرسمہا راجہ کے حدود میں آنے والے علاقے راجیو نگر، بی منجپ اور سات گلی میں واقع مختلف جگہوں میں خالی سائٹوں کے لیے نیلامی ہوگی جس کی تفصیل اخبارات میں شائع ہوئی ہے، مگر اردو اخبارات میں اس اطلاع کی خبر شائع نہ ہونے کی وجہ سے اردو والوں کو مایوسی ہوئی۔

(سالار۔ بنگلور)

اردو میڈیم سے روسٹر سسٹم کی برخاستگی کا مطالبہ

سنگاریڈی (۵ دسمبر)۔ جناب محمد منہاج رحمت، جناب محمد افتخار، جناب شیخ محمد رفیع الدین، جناب محمد مقصود، جناب شیخ جہانگیر، جناب گورے بھائی سکندر، نے جناب شیخ محمد اقبال آئی پی ایس (ڈی آئی جی) کمشنر محکمۂ آلبکاری آندھرا پردیش سے بے بیجے کارڈن فنکشن ہال ظہیرآباد میں منعقدہ تقریب میں بہ حیثیت مہمان خصوصی شرکت کرتے ہوئے نوجوانوں کی ہمت افزائی کرنے پر اظہار تشکر کیا اور ان سے نمائندگی کی کہ اردو میڈیم اساتذہ کی اسامیوں پر عائد روسٹر سسٹم کی برخاستگی کے لیے چیف منسٹر سے موثر نمائندگی کریں۔ روسٹر سسٹم کی برخاستگی پر 900 سے زائد اردو ٹیچرس کے تقررات کی راہ ہموار ہوگی۔ سابق میں کسی بھی ڈی ایس سی کی تکمیل کے بعد اردو میڈیم اسامیوں کو روسٹر سسٹم سے مستثنیٰ قرار دیتے ہوئے اردو میڈیم کے اہل امیدواروں کا ان اسامیوں پر تقرر کیا جاتا تھا یہ محکمۂ تعلیمات کی قدیم روایت رہی ہے۔ چوں کہ اردو میڈیم کے لیے ایس سی، ایس ٹی طبقات سے اہل امیدواروں کا حصول خارج از بحث ہے یہ روایت سال ۲۰۰۶ تک برقرار رہی لیکن اس کے بعد محکمۂ تعلیمات نے اس روایت کو ترک کردیا جس کی وجہ سے اردو میڈیم اسکولوں اور طلبہ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ روسٹر سسٹم کی برخاستگی کوئی نیا عمل نہیں ہے۔ ضرورت صرف اس قدیم روایت کو احیا کرنے کی ہے۔ جناب شیخ محمد اقبال (کمشنر آلبکاری بہبود) نے ان کی نمائندگی کی بہ غور سماعت کی اور ممکنہ اقدام کرنے کا تیقن دیا۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

نگرانی ہونے کی وجہ سے اردو میڈیم کے طلبہ و طالبات کو صحیح تعلیم نہیں مل رہی ہے اور طلبہ و طالبات کی تعداد میں بھی کمی ہورہی ہے۔ جناب سوئی ریڈی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر سنگاریڈی نے پروسیڈنگ نمبر 12906/بی 2013-14 کے ذریعے اردو میڈیم پرائمری اسکول حسن آباد کو تمام سہولیات مثلاً عمارت (بلڈنگ)، باؤنڈری وال، گیٹ، لائبریری کتابوں کے ساتھ، رجسٹر، مکمل فرنیچر، پانچ اساتذہ اور دوسری تمام بنیادی سہولیات کے ساتھ تلگو میڈیم مینجمنٹ سے علاحدہ کرنے کے احکام جاری کیے ہے۔ جناب محمد مشتاق محی الدین نے لوگوں اور والدین سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکول میں شریک کروائیں اور حکومت کی لازمی تعلیم اسکیم سے استفادہ کریں۔

(سیاست۔ حیدرآباد)

اردو کے لیے محکمۂ تعلیم کا رویہ معاندانہ

جالے، بہار (۲۰ دسمبر)۔ ایک طرف حکومت اردو کے فروغ کے لیے ہر طرح کے بلند و بانگ دعوے کر رہی ہے، اعداد و شمار بتائے جاتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ حکومت اردو کے فروغ کے لیے ہر طرح سے پرعزم ہے، لیکن عملی طور پر جو چیزیں سامنے آرہی ہیں ان سے یہی پتا چلتا ہے کہ حکومت چاہے جو بھی دعوے کرے لیکن محکمہ جاتی طور پر اردو کو نقصان پہنچانے اور اس کو نیست و نابود کرنے کے لیے ہر طرح کا حربہ اختیار کیا جارہا ہے۔ ان خیالات کا اظہار ضلع پارشد رکن محمد حبیب اللہ ہاشمی نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ تعلیمی سال 2013-14 کے لیے جو اعداد و شمار کی تفصیلات دینے کے لیے اردو اسکولوں کو فارم DCF جاری کیے گئے ہیں۔ اس کے صفحہ نمبر ۹ پر کالم 6 کے تحت تعلیم کا اصل موضوع درج ہے، اس میں تمام موضوعات درج ہیں جس میں یہ نشان زد کرنا پڑتا ہے کہ کون سا ٹیچر کس سبجیکٹ سے منسلک ہے، لیکن اس میں اردو، فارسی اور عربی کا کہیں دور دور تک تذکرہ نہیں جس کے سبب وہ اساتذہ جن کی بحالی اردو یونٹ کے لیے ہے اور وہ اردو ٹیچر کے نام پر بحال ہیں، ان کے لیے مسئلہ کھڑا ہوگیا ہے کہ وہ اپنا نام کس موضوع کے تحت درج کرائیں۔ مجبور ہوکر ایسے اساتذہ ہندی یا کسی اور موضوع کے لیے اپنا نام درج کراتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محکمۂ تعلیم کا نظریہ اردو کے تئیں مخلصانہ نہیں بلکہ معاندانہ ہے۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ فارم DCF کی اشاعت SCERT نے کی ہے۔ ہاشمی صاحب نے کہا کہ اس کو کیا مانا جائے۔ محکمۂ تعلیم کا اردو زبان کے تئیں معاندانہ رویہ یا پھر اشاعت کی غلطی۔ انھوں نے کہا کہ اگر یہ غلطی ہے تو اس میں فوری طور پر سدھار کیا جانا چاہیے۔ اگر ایسا جان بوجھ کر کیا جارہا ہے تو اردو دوستوں کو اس طرف مضبوطی سے آگے بڑھتے ہوئے محکمے کی اردو دشمنی سے لوگوں کو آگاہ کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ٹی ای ٹی امتحان میں جس طرح سے پیپرز میں سوالوں کے جوابات تلافیہ کرکے امیدواروں کو بڑی تعداد میں ناکام کردیا گیا اور اب یہ معاملہ۔ ان سب سے واضح ہوتا ہے کہ محکمۂ تعلیم میں کہیں نہ کہیں کھوٹ ہے یہ نہ صرف اردو زبان کو زک پہنچانے کی کوشش ہے بلکہ لسانی اقلیت کے ساتھ دھوکہ ہے۔

(اردو ایکشن۔ بھوپال)

ڈاکٹر نثار راہی کی کتاب 'آسماں احساس' کی رسم رونمائی

جودھپور (پریس ریلیز)۔ ادب کی شاعری صرف سماج اور سیاست کی نہیں بلکہ ثقافت کی سچائی کی جانب بھی اشارہ کرتی ہے۔ ہم شاعری میں تاریخ کے نقوش ڈھونڈتے ہیں جب کہ ہمیں اس میں تہذیب کی ترجیحیں تلاش کرنی چاہیے اور ڈاکٹر نثار راہی کے یہاں مختلف الفاظ کیفیت میں ڈھلتے نظر آتے ہیں۔ ان خیالات کا اظہار معروف شاعر اور نقاد شین کاف نظام نے ڈاکٹر نثار راہی کے دوسرے شعری مجموعے 'آسماں احساس' کی تقریب رسم رونمائی میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ نثار کے یہاں جذبے کو زبان عطا کرنے کا ہنر ملتا ہے۔ اشراق الاسلام ماہر نے 'مشاہدوں میں خود کو ڈھونڈتا شاعر' عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ لفظوں سے تصویر بنانے والے نثار کا مجموعہ ایک البم ہے۔ 'اعتقاد' کے مدیر عادل رضا منصوری نے کہا کہ نثار غزل میں نئے امکانات تلاش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ڈاکٹر حبیب رؤل نے کہا کہ نثار کے یہاں ابھرتے ہیں کو پورا کرنے کا احساس موجود ہے۔ ایل آئی سی آف انڈیا کے سینئر ڈویژنل منیجر بجے شرما نے جودھپور کے ادبی ماحول کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ نثار کا ہمارے محکمے میں ہونا فخر کی بات ہے۔ سروکار کے سکریٹری اور نوجوان شاعر برجیش امبر نے استقبالیہ تقریر کی۔ اس موقع پر ڈاکٹر نثار راہی نے مجموعے سے 'اقتدا' حاصل نظم، ہم وقت شاعر، نظمیں اور غزلیں سناکر داد حاصل کی۔ اجلاس میں ہندی، اردو اور راجستھانی زبان کے ادیبوں کے علاوہ معزز افراد موجود تھے۔ نظامت کے فرائض شمیم صنیف نے ادا کیے۔

ہم شکر گزار ہیں

پروفیسر سید منظور احمد نے انجمن ترقی اردو (ہند) کے آرکائیوز کے لیے مشاہیر کے 150 خطوط عنایت کیے ہیں جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ جن حضرات کے خطوط ہمیں موصول ہوئے ہیں ان کے اسمائے گرامی حسب ذیل ہیں:
مالک رام، جگن ناتھ آزاد، سری نواس لاہوٹی، محمد صابرین، اسلم پرویز، مجتبیٰ حسین، خلیق انجم، محمد ایوب تاباں، گوپی چند نارنگ، صابروت، آزاد گلاٹی، اطہر فاروقی، ممنون حسن خاں، ہمت رائے شرما، بشیر بدر، چودھری اور راج بہادر گوڑ وغیرہ۔

انیس احمد

انچارج اردو آرکائیوز

اردو میڈیم مدارس اور

اساتذہ کے مسائل پر تبادلۂ خیال

جگتیال، آندھرا پردیش۔ تلنگانہ اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن جگتیال ڈویژن کا ایک اجلاس گورنمنٹ ہائی اسکول قاضی پورہ جگتیال میں منعقد ہوا جس میں جگتیال، کورٹلہ، مٹ پلی، رائیکل، ملہ پلی، جلگل وغیرہ کے اردو میڈیم اسکولوں کے اساتذہ شریک ہوئے۔ جناب محمد ریاض الدین ماما صدر سوتا نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس اجلاس میں اردو میڈیم طلبہ کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے کے علاوہ اردو میڈیم مدارس اور اساتذہ کو درپیش مسائل پر تبادلۂ خیال کیا گیا، بعد ازاں محمد الیاس ریاستی فائنانس سکریٹری توتا کے زیر نگرانی اور ضلعی صدر خواجہ نصیر الدین کی صدارت میں جگتیال ڈویژن کے تلنگانہ اردو میڈیم ٹیچرس ایسوسی ایشن کے تنظیمی انتخابات عمل میں آئے۔

(رہنمائے دکن۔ حیدرآباد)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : ارشد مینا نگری: ایک جامع الکمالات قلم کار
مصنف : ڈاکٹر محبوب راہی
ضخامت : ۱۴۱ صفحات
قیمت : ۱۲۵ روپے
ملنے کا پتہ : ڈاکٹر محبوب راہی
بارسی ٹاکلی، ضلع اکولہ
مہاراشٹر
تبصرہ نگار : مفتی حبیب الرحمٰن ندوی
muftihabib0786@gmail.com

مختلف اصناف شعر و ادب پر مشتمل چالیس کتابوں کے مصنف ڈاکٹر محبوب راہی کو شاعر و ادیب کے ساتھ ساتھ ایک مستند نقاد تسلیم کرتے ہوئے اردو کے بیشتر معتبر قلم کاروں نے موصوف کو توصیفی تنقید یا حوصلہ افزائی کی روایت کا بنیاد گذار قرار دیا ہے، جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ راہی صاحب نے جہاں میر، غالب، اقبال، گوپی چند نارنگ اور مظفر حنفی جیسی تاریخ شعر و ادب کی عالمی حیثیت کی حامل نمائندہ شخصیات پر کتابیں اور مضامین لکھے ہیں وہیں اپنے ہم عصروں اور نسبتاً نو واردو اور کم معروف قلم کاروں پر بھی سیر حاصل اور مثبت انداز فکر کے مضامین لکھ کر اپنی فراخ دلی اور بلند حوصلگی کے ثبوت فراہم کیے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب راہی صاحب نے اپنے ہم عصر اور دور حاضر کے مشہور و مقبول شاعر ارشد مینا نگری کے شعری کمالات کے اظہار و اعتراف کے لیے لکھی ہے، جس میں ارشد مینا نگری کی مختلف الموضوعات مثلاً غزلیات، منظومات، بچوں کی شاعری، حمد، سہرے اور بنی نوع انسان کا سب سے زیادہ جذباتی موضوع 'ماں' عنوانات کے تحت تصانیف پر کیے گئے اردو کے صاحب نقد و نظر قلم کاروں کے مضامین، تبصروں اور تجزیوں کی روشنی میں اپنا ایک جامع تجزیاتی نظریہ پیش کرتے ہوئے ارشد مینا نگری کو ایک جامع کمالات قلم کار ثابت کیا ہے۔

انتساب، موضوع کتاب ارشد مینا نگری کے نام کرکے راہی صاحب نے اختراع پسندی کا ثبوت دیا ہے، نیز اپنے دو صفحاتی پیش لفظ کے وسیلے سے اس کتاب کے منظر عام پر آنے کو ایک کرشماتی سلسلہ قرار دیا ہے۔

فرزند ارشد، ندیم ارشد کی مرتبہ توقیت مینا نگری کے بعد ماہنامہ 'اسباق' کے مدیر ڈاکٹر نذیر فتح پوری نے گفتہ باہمی کے تحت راہی صاحب کی اس تصنیف کو دو ہم عصر تخلیقی قلم کاروں کے باہمی تال میل کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ درمیانی صفحات میں جابجا مشاہیر ادب کے ساتھ کھینچی گئی تصویریں ارشد مینا نگری کے ہمہ گیر تعلقات، ان کی اعلا وارفع حلقوں میں محبوبیت اور مقبولیت کی روشن دلیلیں ہیں۔

⊙⊙⊙

نام کتاب : قرۃ العین حیدر
ادب، عہد اور حیات
(دسمبر ۱۹۲۷ تک)

اشاعت : ۲۰۱۳
مصنف : ہربنس سنگھ تصور
ضخامت : ۱۳۰ صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
ناشر : موڈرن پبلشنگ ہاؤس
۹۔ گولا مارکیٹ، دریا گنج
نئی دہلی۔۱۱۰۰۰۲
تبصرہ نگار : دیپک بدکی
deepakbudki@gmail.com

قرۃ العین حیدر کے شیدائی ہربنس سنگھ تصور نے پہلی بار ۱۹۵۹ میں رسالہ 'نقوش' میں افسانہ 'ستمبر کا چاند' پڑھا اور اس کے بعد باضابطہ قرۃ العین حیدر کا مطالعہ کرنا اپنا منصب بنا لیا، یہاں تک کہ ایم اے (اردو، پنجابی) کرنے کے بعد انھوں نے 'قرۃ العین حیدر بہ حیثیت ناول نگار' عنوان پر ڈاکٹریٹ کر لیا۔ بقول صغرا مہدی ''سردار ہربنس سنگھ تصور ان کے مداح بھی ہیں، ان کے فن کی تہہ داری کو سمجھتے بھی ہیں اور اس کو قاری تک پہنچانے کے ہنر سے بھی خوب واقف ہیں اور ان کی تمام تر تحریروں کی جانکاری بھی رکھتے ہیں۔'' ہربنس سنگھ تصور ۱۵ اپریل ۱۹۳۸ کو سری پنڈ صاحب (حسن ابدال، پاکستان) میں پیدا ہوئے، تقسیم وطن کے بعد چنڈی گڑھ میں محکمہ تعلقات عامہ پنجاب سے منسلک رہے اور آخرکار موہالی، پنجاب میں مستقل سکونت اختیار کی۔ اس سے پہلے بھی موصوف کی چار تصانیف 'قرۃ العین حیدر قاف تا قاف'، 'صدا صد منظر' (شعری مجموعے اردو، ہندی)، 'غزل عرش' ڈبگل (پنجابی، گورمکھی) اور 'سیزنز ور مائین' (Mine Seasons were) منصۂ شہود پر نمودار ہو چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں قرۃ العین حیدر کے مجموعے 'ستاروں سے آگے' کے چودہ افسانوں اور دیگر افسانوں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جن کے بارے میں خود مصنفہ نے کہا تھا کہ ''مجھے حیرت ہوئی کہ میں کیا لکھتی ہوں۔'' ان کے فن کے متعلق سید نقیبی، جو قرۃ العین حیدر کو اردو فکشن کا 'ماسٹر اسٹروک' گردانتے ہیں، فرماتے ہیں کہ ''وہ پورے ادب کا احاطہ کرتی ہیں۔ وہ اس کا جزو بھی ہیں اور کل بھی... ان کی فکشن میں ادب کی ہر صنف کے جوہر پس منظر میں موجود رہتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں کیمرہ کم اور تجریدی پینٹنگز زیادہ ہیں۔''

ابتدا میں ہربنس سنگھ تصور نے افسانہ و فکشن نگار کے سلسلۂ نسب، پیدائش، تعلیم اور حیات کے دیگر اہم گوشوں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے اور ان کے آبا و اجداد کے پیکر ان پر بھی بحث کی ہے جو ادب سے جڑے رہے۔ ان لوگوں میں قرۃ العین کے والدین سجاد حیدر یلدرم اور نذر سجاد کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے، جو ابتدا میں 'لالہ رخ' کے قلمی نام سے لکھتی تھیں، افسانے ۱۹۴۲ کے بعد (حالاں کہ ۱۹۳۸ میں پہلی بچوں کی کہانی شائع ہوئی تھی) منظر عام پر آنے لگے جب ترقی پسندی اپنے عروج پر تھی۔ انھوں نے اپنے لیے ایک الگ روش چن لی جو کسی مکتب کی تابع نہیں تھی۔ مجموعہ 'ستاروں سے آگے' جس میں شامل افسانوں پر اس کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے، ۱۹۴۷ء میں صادق الخیری نے 'خاتون کتاب گھر' سے شائع کی۔ بقول اعجاز بٹالوی ''انگارے کی اشاعت نے ذہنی احتجاج کو جلا بخشی اور 'ستاروں سے آگے' کے اظہار میں شخصیت، شعور اور شیشہ ساعت نے رنگ برنگ آوازوں کو جنم دیا۔'' اس کے برعکس رشید امجد فرماتے ہیں کہ ''ممتاز شیریں، حسن عسکری اور قرۃ العین حیدر، یہ تینوں افسانہ نگار ہمارے معاشرے سے تعلق نہیں رکھتے۔ ان کے افسانے مغربی کلچر سے بے حد متاثر ہیں۔'' خود قرۃ العین کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ ان پر مغرب زدگی اور انگریزی زبان کے وافر استعمال کا الزام لگایا جاتا ہے جب کہ ترقی پسند انھیں رجعت پسند بھی کہتے ہیں۔ اس کے برعکس احمد ندیم قاسمی فرماتے ہیں کہ ''قرۃ العین حیدر کی کہانیوں میں غزل کی سی مٹھاس اور نظم کی سی روانی ہے۔ وہ منفرد بھی ہیں اور منشرح بھی۔ وہ ایک سچی آرٹسٹ اور اردو ادب کے مستقبل کا افق ہے۔''

تصور نے قرۃ العین حیدر کے ۲۴ افسانوں کا الگ الگ تجزیہ کیا ہے اور ہر دو افسانے کی اشاعتی تفصیل، پس منظر، لب لباب اور تکنیک پر روشنی ڈالی ہے۔ ان تجزیوں سے چند معنوی اقتباسات ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

☆ ''قرۃ العین حیدر نے اپنے اس تقریباً پہلے افسانے (ایک شام) میں ہی ترقی پسند تحریک کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے۔''

☆ ''قرۃ العین حیدر کے لیے وقت یا تقدیر کی بڑی اہمیت ہے''۔ ''میں نے سوچا کہ جس نظام کے ماتحت ہماری زندگی رواں ہے اسے میں بدل تھوڑا ہی سکتی ہوں۔ جو ہو رہا ہے اور ہوتا آیا ہے وہی ہوگا۔ (قرۃ العین حیدر)''

☆ ''اس افسانہ (دریچے کے سامنے) میں شاید پہلی بار قاری اپنی مصنفہ کی ایک دیگر پسند (پہلی پسند کامریڈوں کی کیتھائی) سے متعارف ہوتے ہیں اور وہ ہے قلمی دنیا۔''

☆ ''یہ (ستاروں سے آگے) ایک تاثراتی تحریر ہے۔ ایک ہی منزل کی طرف جانے والوں کے اپنے اپنے راستے ہیں، اپنے اپنے میل پتھر ہیں، اپنا اپنا زادِ راہ ہے، اپنا اپنا جوش ہے اور اپنی اپنی تھکاوٹ بھی ہے۔''

☆ ''قرۃ العین حیدر خوش تھی اور آئیڈیل ازم کے نعرے سے بھی متاثر نہیں ہوئیں۔ وہ رونما ہونے والے واقعے کو اس کے صحیح تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس افسانے (اودھ کی شام) میں تقسیم سے قبل ہی وہ تقسیم کے المیہ کو دیکھ رہی ہیں۔''

☆ ''قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں 'بات چیت' یا 'مکالمہ' کا ہم بہت کردار دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ افسانہ (رقص شرر) صرف مکالمہ پر مبنی ہے۔ اس میں بات چیت اور افسانہ ہیں ایک دوسرے کو خوب راس آئے۔''

☆ ''ان افسانوں میں افسانہ کے لیے ضروری اور مروجہ عناصر یعنی ترتیب با جواز تعمیر، عروج اور ارتقائے قصہ وغیرہ کی سامنے کی قدر و قیمت کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ سب کا مقدور مقام محبت ٹھہرا۔ کہیں کہیں مکالمہ کردار کا روپ دھار لیتا ہے اور کردار ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں... دراصل عینی صاحبہ افسانہ کے لیے خام مواد کا انتخاب شعوری اور غیر شعوری دونوں سطحوں پر کرتی ہیں اور آمد کو ترجیح دیتی ہیں۔''

زیر نظر کتاب 'قرۃ العین حیدر قاف تا قاف' کے بعد قرۃ العین حیدر کے حوالے سے ایک اور اہم سنگ میل ہے۔ یہ موصوف کی شخصیت اور ان کی ابتدائی فنی خصوصیات پر بھرپور روشنی ڈالتی ہے۔ اس طرح یہ نہ صرف ان قارئین کے لیے ضروری ہے جو قرۃ العین کی نگارشات کے دیوانے ہیں بلکہ حوالہ جاتی وجہ رکھنے کے سبب اردو لائبریریوں کے لیے بھی بہت کارآمد ہے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ تصور صاحب اس سلسلے کی اور بھی کڑیاں مستقبل میں جوڑتے رہیں گے۔ ◆◆◆

بقیہ: اردو- ہندی- ہندستانی

صفحہ ۸ سے آگے

ہندوئی زبان ہے کچھ تو فرقہ وارانہ جذبہ اور زمانہ قدیم کی طرف جانے کی خواہش، دیکھا ایک قومی زبان تعمیر کرنے کا خیال اور کم سے کم شروع میں ایک حد درجہ تک حکام کے خود غرضانہ اشارے اور ان کی مدد۔ ان تمام چیزوں کے سہارے پچھلے تیس چالیس سال سے ملک میں رائج کی جا رہی ہے اس کے مقابلے میں اردو ایک زیادہ قدرتی اور زندہ زبان ہے۔ یہ دونوں اس ملک کی پیدائش۔ رہا سوال ویاکرن (قواعد) کا، آج کل کی ہندی کو اپنا ویاکرن اور ڈھانچہ ظاہر ہے اردو ہی سے لینا پڑا۔ اودھی یا برج بھاشا ایک آٹھ سو سال پہلے کی ہندی سے نہ تو اپنا ویاکرن لے سکتی ہے اور نہ وہ چل سکتا ہے۔ ان نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس وقت اردو اور ہندی کا ویاکرن (قواعد) اور ڈھانچہ ایک ہی ہے اور ایک ہی ہونا چاہیے اور اس سے بھی آئندہ ایک ہندستانی زبان کے جنم کی امید ہو سکتی ہے لیکن ہندی کے کچھ ایسے ودوان (عالم) جو گھروں میں الہ آبادی، بہاری، اودھی وغیرہ بولتے ہیں یعنی جن کی مادری زبان نہ ہندی ہے نہ اردو، کئی طرح سے ہماری اس ہندستانی زبان کے بنے بنائے ویاکرن کو خراب کر رہے ہیں، مثلاً تذکیر و تانیث میں یہ لوگ اکثر سنسکرت لغت سے شبدوں کے تذکیر و تانیث کا پتا لگا کر ہندی میں اسی طرح رائج کرنے کی خلاف قدرت کوشش کرتے ہیں اور بھی کئی چیزیں ہیں لیکن میں ان کی وضاحت میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ ہماری زبان ایک اعلا زندہ زبان ہے جو ہزاروں سال میں آہستہ آہستہ اس روپ تک آئی ہے اور آئندہ بھی

بدلے گی، لیکن سنسکرت وہ نہیں ہے نہ اس کا ویاکرن سنسکرت ویاکرن ہے۔ سنسکرت میں تین وچن (صیغے) ہیں، ہندی میں دو۔ سنسکرت میں ۔۔ تا اور چد وناؤں کے لیے ایک (کچھتی) سے کام چل جاتا ہے۔ ہندی میں ہم دو علاحدہ علاحدہ فعل استعمال کرتے ہیں، وغیرہ۔

ہاں کچھ مصنف ہر زبان کے ایسے ضرور ہوتے ہیں جو ویاکرن کے قاعدوں سے بندھنا نہیں چاہتے۔ ان میں کچھ اعلا مرتبے کے ہوتے ہیں جنھیں ایسا کرنے کا اختیار بھی دیا جا سکتا ہے، مثلاً ہندی میں مرحوم پنڈت بالکشن کرشن بھٹ، لیکن اگر یہ قصور ہے تو جہاں تک مجھے معلوم ہوتا ہے ہندی یا اردو کا کوئی قدیم یا حال کا ادیب اس معاملے میں شاید اتنا قصوروار نہیں ہے جتنا مرحوم بھٹ جی۔

اردو کے بہت سے ادیب اردو لفظوں کی فارسی، عربی جمع کا استعمال ضرور کرتے ہیں۔ یہ رواج اتنا ہی غلط کہا جاسکتا ہے جتنا ہندی میں سمیک رونچن لکھنا یا مانا دی کی جگہ شوچالیہ لکھنا۔ میں یہ بھی عرض کردوں کہ اردو میں نئے زمانے کافی ادیب اس طرح کے ہیں جو اس رواج کی کھلی مخالفت کرتے ہیں، لیکن پھر بھی وکیلوں کی جگہ وکلا لکھنے سے ہمارا ویاکرن (قواعد) اتنا نہیں بدل جاتا جتنا 'وایو' (ہوا) بہہ رہی ہے کی جگہ 'وایو' بہہ رہا ہے لکھنے سے، اس لیے، کیوں کہ سنسکرت میں وایو مذکر ہے۔

(۳) آپ نے لکھا ہے "مولوی عبدالحق صاحب نے ہندی، ہندستانی کے بجائے صرف ہندستانی یا ہندی اردو کے پریوگ (استعمال) کا پرستاؤ (تجویز) رکھا تھا۔ مجھے تو ان دونوں میں کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن بھارتیہ ساہتیہ پریشد اپنے جنم (پیدائش) کو نہیں بھول سکتی۔ اسی لیے شبد (لفظ) جو رکھنا ضروری ہو گیا۔

اگر بھارتیہ ساہتیہ پریشد ہندی ساہتیہ سمیلن کا ایک انگ ہے اور اسی طرح اسے کام کرنا چاہیے تو آپ کی باقی بات تو ٹھیک ہے۔ پھر تو یہی غنیمت ہے کہ آپ کے اثر سے انھوں نے محض 'ہندی' کی جگہ ہندی ہندستانی رکھنا منظور کر لیا۔ اور اگر جس زبان میں وہ استعمال کریں وہ ٹھیٹ ہندستانیت کے کچھ نزدیک آوے تو خوش قسمتی کی بات ہوگی۔ لیکن مولانا عبدالحق کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ غلط فہمی اس بارے میں ہوگئی۔ جو اردو ادیب وہاں آئے تھے وہ غلط امیدیں باندھ کر آئے تھے۔ میں بڑے سنکوچ (جھجک) کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ شاید انھیں دعوت دینے میں بھی یہ احتیاط ضرور ہوئی۔ ملک کی بڑی بھی خوش قسمتی ہوگی اگر آپ کی رہنمائی میں کوئی ایسی ہندستانی ساہتیہ پریشد قائم ہوسکتی جو اپنے رسالوں اور کتابوں میں ہندستانی زبان لکھنے کی کوشش کرتی اور جس کی چیزیں ناگری اور فارسی دونوں حروف میں نکل کر ہندی اور اردو دونوں کے پڑھنے والوں کو آہستہ آہستہ ہندستانی زبان کی طرف لاتیں۔

باپو جی! میں نے عبدالحق صاحب کے خط اور آپ کے لیکھ (مضمون) دونوں کو ملا کر پڑھا۔ جو شکوک اس خط سے پیدا ہوتے ہیں آپ کے لیکھ (مضمون) سے وہ رفع نہیں ہوتے۔ میں آپ سے پرارتھنا (التجا) کروں گا کہ آپ پھر ایک مرتبہ اس خط کو دیکھیں۔ اور اگر ہوسکے تو آپ بھی ان کے شبہوں کو رفع کریں۔ جس طرح سے انھوں نے واقعات کو بیان کیا ہے اس میں غلطی ہوسکتی ہے۔ ان کی رائے بھی کم سے کم میں تو پوری بات میں ماننے کو نہیں تیار ہوں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خط دکھے ہوئے دل سے اور نیک نیتی کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ان کے شکوک رفع ہونے چاہئیں تھے۔ میں صرف ایک مثال دوں گا۔

اس خط کے مطابق آپ نے کہا تھا "اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے۔ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا۔ مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں"۔

اگر رزولیوشن میں تنہا ہندستانی کا لفظ رکھا گیا تو اس کا مطلب اردو سمجھا گیا۔ مجھے معلوم ہے کہ گجرات کے مسلمان اردو کو اپنی مذہبی زبان کہتے ہیں۔ میں یہ بھی اندازہ کر سکتا ہوں کہ جب سے اردو ہندی کا یہ بد قسمت جھگڑا چلا دوسرے صوبوں میں اردو کے بہت سے مسلمان مبلغ اردو کو اپنی مذہبی زبان کہہ کر اس کی تبلیغ کرتے ہوں گے۔ یہ بھی ہماری بدقسمتی ہے کہ یہ خالص ادبی سوال فرقہ وارانہ سوال بن گیا۔ لیکن ان باتوں سے واقعات نہیں بدل سکتے۔ اردو نہ مسلمانوں کی اور نہ کسی اور کی مذہبی زبان ہے اور نہ کبھی تھی۔ وہ محض اس ملک کے لاکھوں رہنے والوں کے حق میں ہندو، مسلمان عیسائی اور جین سب شامل ہیں۔ قدرتی اور مادری زبان ہے، اس کو ترقی دینے میں ہندوؤں نے اتنا ہی حصہ لیا ہے جتنا مسلمانوں نے۔ اور آج تک بہت سے ہندوؤں کو اس پر ویسا ہی فخر ہے جیسا کہ مسلمان کو ہوسکتا ہے۔ ہندی میں تو رامائن بھی ہے جسے کم سے کم شمالی ہند کے لاکھوں ہندو اپنی ویسی ہی مذہبی کتاب مانتے ہیں جیسی کسی دوسری کتاب کو۔ اردو میں تو مسلمانوں کی کوئی اس طرح کی کتاب بھی نہیں ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو کہ بہت سے کٹر مسلمان مولویوں کو قرآن کے اردو میں ترجمہ ہونے پر سخت اعتراض تھا اور کچھ کو آج تک ہے۔ آپ کو شاید یہ بھی معلوم ہو کہ شمالی ہند میں کم سے کم ہزاروں ہندو گھر ابھی تک ایسے ہیں جہاں دسہرے کے دن پوجا کے وقت (پوہب کا پرہ اور چھیم کو کھوڑا، اگر کا تیر اور جھن کا تیر دیا ان سے بنتے چلتے الفاظ کا منتر پر اردو حرفوں میں لکھے جاتے ہیں اب اگر اس طرح کے لوگوں کو دھرم سے گرا ہوا کہہ کر علاحدہ کر دیا جائے یا مہلک تنگ خیالی کے اثر میں ہم ان طریقوں کو بدلنے کی کوشش کریں تو وہ دوسری بات ہے۔

یہ بھی ٹھیک نہیں ہے کہ اردو قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اگر ہم اردو کو قرآن کے حرفوں میں لکھنے کی کوشش بھی کریں تو معمولی حرفوں کی شکلیں کافی بدل ہی جاویں گی۔ ہمیں پڑوی کو فروی لکھنا پڑے گا۔ چاند کو چاند اور گھوڑے کو گاڑے یا گانے۔ کھانا کو کانا وغیرہ۔ آج کل کے فارسی حروف جن میں ہندستانی آوازوں کو ظاہر کرنے کے لیے کچھ نئی علامتیں جوڑ کر اردو لکھی جاتی ہے۔ عربی حروف (خط نسخ) سے صدیوں پہلے کی ایجاد ہیں۔ دونوں میں مشابہت بھی ہے لیکن مشابہت تو گجراتی، بنگلہ اور ناگری حرفوں میں بھی کافی ہے۔ آوازیں تو بالکل وہی ہیں۔ اس کی بنا پر یہ کہنا تو شاید ٹھیک نہ ہوگا کہ گجراتی اور بنگالی رگ وید کے حرفوں میں لکھی جاتی ہیں۔

یہ بات الگ رہی کہ کسی خاص کتاب کے حروف میں لکھے جانے کی وجہ سے بھی کوئی زبان کسی خاص جماعت کی زبان نہیں بن جاتی۔

اوپر کے اقتباس کی باقی باتیں بھی اسی طرح حقیقت کے خلاف ہیں۔

اردو ادب سے واقف اس کے پریمیوں میں خوش قسمتی یا بدقسمتی سے تھوڑے بہت ہندو بھی ہیں جنھیں اس بات پر قدرتی دکھ ہوتا ہے کہ اس اردو ہندی کے اشلوک بھی خاص فرقہ وارانہ شکل دی جاوے۔ آپ کی طاقت اس بارے میں بہت ہے اور میری عاجزانہ پرارتھنا (التجا) ہے کہ آپ اس غلط میلان کو ہونے نہ دیں۔

اس کے علاوہ شاید آپ کو معلوم ہو کہ اردو کے مسلمان ادیبوں میں ایک خاصی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو دل سے آپ کی زندگی کے مقصد کی قدر کرتے ہیں اور اس کے مطابق عمل کرنے کرانے کی بھی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بہت سے ایسے ہیں جو اگر چہ اپنی اخلاقی کمزوری کے وقتی یا کسی دوسری وجہ سے سیاسی تحریک میں مناسب حصہ نہیں لے سکتے، تو ہم اپنے میدان میں قومی اتحاد کو قائم کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے میں جی جان سے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اردو رسالوں میں وددان (عالم) مسلمان مصنفوں کے لیکھ اس مضمون کے برابر نکلتے رہتے ہیں کہ ہمیں اردو سے عربی اور فارسی کے غیر مانوس شبدوں (لفظوں) کو نکال کر ہندی کے عام فہم شبدوں کا استعمال کرنا چاہیے۔ ایک مسلم اردو رسالے کی زبان پر کسی کٹر مسلمان نے اعتراض کیا۔ آپ کو تعجب ہوگا۔ وددان (ذی علم) ایڈیٹر نے جواب دیا "میں حجازی اردو سے اپنے رسالے کو ناپاک نہیں کرنا چاہتا"۔ اس چیز پر عمل بھی جتنی کامیابی کے ساتھ آج کل اردو رسالوں میں ہو رہا ہے کسی ہندی رسالے میں نہیں ہورہا ہے۔ لاہور کے رسالہ 'نیرنگ خیال' سے میں نے اردو نظم و نثر دونوں کے کچھ نمونے اپنے دکھن بھارت ہندی پرچار سبھا مدراس کے کانووکیشن ایڈریس میں نقل کیے تھے جنھیں آپ اگر جوں کا توں ناگری حرفوں میں کسی ہندی رسالے میں شائع کرادیں تو کسی بھی پڑھنے والے کو یہ گمان بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ اردو سے لیے گئے ہیں۔ یہ سب مسلمانوں کے لکھے ہوئے ہیں۔ مجھے شک ہے کہ کسی ہندی رسالے سے شاید کوئی ایک نمونہ بھی ایسا نہیں نکالا جاسکتا جسے اگر جوں کا توں چھاپ دیں تو محض اردو پڑھ سکنے والا اسے پڑھ کر اردو ہی سمجھے، آپ خود کسی وقت آسمرہ کی ہندستانی زبان کے لحاظ سے سندر (خوب صورت) اپنی خلیق زبان بولا کرتے تھے کہ جسے سن کر اردو والے اور ہندی والے دونوں کا دل خوش ہو جاتا تھا۔ دونوں سمجھتے تھے لیکن نہ کبھی کی جو آپ کی تقریروں کی توں دی کی جامعہ میں چھپی ہے وہ... ٹھیٹ نہیں ہے۔

مولانا سلیمان ندوی جیسے وددان (ذی علم) جنھوں نے اپنی یوم اتحاد کی چھپی ہوئی تقریر میں بجائے حضرت محمد کے سوامی محمد لکھا ہے۔ برسوں سے زوروں کے ساتھ کھلے طور پر کوشش کررہے ہیں کہ ہمیں نہ صرف اردو کو محض ہندستانی بنانا چاہیے بلکہ اردو کی جگہ اسے ہندستانی کہنا چاہیے۔ رسم الخط کا سوال علاحدہ ہے۔ ان قابل تعریف کوششوں کی کچھ جھلک آپ کو عبدالحق صاحب کے خط میں بھی مل سکتی ہے۔ یہ سب کافی حد تک آپ ہی کے پریم (محبت) اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ تھا۔ مگر ناگپور سے اب تک جو ہوتا گیا ہوا بہت سے اس طرح کے سچے اور سنجیدہ مسلمان کام کرنے والوں کے دل بھی شکوک اور مایوسی سے ٹکڑے ٹکڑے ہورہے ہیں جو اپنے دکھ کو اپنی زبان تک بھی لانا نہیں چاہتے۔

خط بند کرنے سے پہلے رسم الخط کی بابت بھی اپنا خیال آپ کے سامنے رکھ دوں۔ بہت دنوں سے لوگ رومن رسم الخط کے حق میں ہیں، مثلاً بابو راجا نند چٹرجی وغیرہ۔

میں ۱۹۳۶ کے شروع تک اس کے خلاف رہا لیکن اب کچھ رائے بدل رہی ہے۔ (دیکھیں میں آپ کا وقت ضائع نہ کروں گا۔

آپ کا خادم
سندر لال
۵۶ چک الہ آباد
۳۶-۹-۲۳

[جامعہ، اکتوبر ۱۹۳۶ء، دہلی]

***

گاہے گاہے باز خواں

اردو - ہندی - ہندستانی

سُندر لال جی کا خط مہاتما گاندھی کے نام

بابائے قوم مہاتما گاندھی کے نام پنڈت سندر لال جی کا ایک خط جس میں 'اردو، ہندی، ہندستانی' کے اہم موضوع پر گفتگو کی گئی ہے، جسے ہم یہاں گاہے گاہے باز خواں کے طور پر نقل کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

پچھلی اگست کے 'ہریجن سیوک' میں میں نے آپ کا لیکھ (مضمون) غلط فہمیوں کی کھیتی پڑھا تھا۔ اسی وقت آپ کو کچھ لکھنے کا مجھے خیال ہوا۔ تب سے اب تک کئی بار یہ خیال ذہن میں آیا۔ لیکن کئی سببوں سے سنکوچ (جھجک) کر کے رہ گیا۔ حال میں ایک دوست نے مجھے لاہور کے اردو روزنامہ 'انقلاب' کا ۳۰ جون کا پرچہ لا کر دیا جس میں اکھل بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے ناگپور اجلاس کے بارے میں مولانا عبدالحق کا لمبا خط چھپا ہے۔ ظاہر ہے یہ خط آپ نے دیکھا ہے اور جن کترنوں کو سامنے رکھ کر آپ نے اپنا لیکھ (مضمون) لکھا ہے ان میں یہ خط بھی رہا ہوگا۔ محض اپنا فرض سمجھ کر میں آج یہ لمبا خط لکھ رہا ہوں۔ آپ کے لیکھ (مضمون) کی نیچے لکھی ہوئی باتوں کی طرف میں آپ کا دھیان دلانا چاہتا ہوں۔

(۱) "اردو نام خاص طور سے اور خاص مطلب سے رکھا گیا" یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ اردو زبان کی تاریخ سے صاف پتا چلتا ہے کہ یہ نام اسی طرح خود بہ خود اس سے پہلے کی ہندی یا ہندوی کے ساتھ بہت سے ایسے عربی، فارسی، ترکی شبدوں (لفظوں) اور محاوروں کے میل سے بنی ہوئی زبان کے لیے رائج ہونے لگا جو لشکری لوگوں میں بولے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ بالکل قدرتی تھا۔ کسی بھی خاص مطلب سے کسی نے یہ نام نہیں رکھا تھا۔ اس کے بعد عرصے تک اس نئی ملی جلی اور مروجہ زبان کے لیے ہندی اور ہندوی شبد (لفظ) بھی استعمال ہوتے رہے، یہ دونوں نام بھی مسلمانوں ہی کے رکھے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں ہی نے پہلے پہل اس زبان کو جو ان سے پہلے ہندستان کی راجدھانی کے آس پاس بولی جاتی تھی، ہند سے ہندی یا ہندوی کہنا شروع کیا، اسے اپنایا اور اسے ترقی دی، بعد میں جب اس زبان میں فارسی، عربی، ترکی سے کچھ شبد (لفظ) اور محاورے مل کر اس کا روپ (شکل) بدلا تو ہندی نام کی جگہ صرف اردو نام کا استعمال ہونے لگنا بھی ایک قدرتی چیز تھی۔ آپ جانتے ہی ہیں فارسی میں (اردو) لشکر یا لشکر گاہ کو کہتے ہیں۔ اسی سے دلّی میں اردو بازار تھا جہاں اس نئی زبان نے شکل اختیار کی۔ مشہور شاعر غالب نے ۱۸۵۷ کے بعد کی دلّی کی بربادی کو بیان کرتے ہوئے اپنے ایک خط میں لکھا ہے: "دلّی والے اب تک یہاں کی زبان کو اچھا کہتے چلے جاتے ہیں واہ رے حسنِ اعتقاد، ارے بندۂ خدا! اردو بازار نہ رہا، اردو کہاں، دلّی کہاں، واللہ اب شہر نہیں ہے کیمپ ہے، چھاؤنی ہے"۔

(۲) ہندی اور اردو ان دونوں شبدوں کا جنم کبھی بھی اور کسی طرح ہوا ہو اور ان کے مصدری معنی کچھ بھی ہوں، اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ آج یہ دونوں نام ہندستانی زبان کی دو الگ الگ شکلوں کے لیے استعمال ہو رہے ہیں اور ان کے دو صاف الگ الگ مروجہ معنی ہیں۔ ایسی صورت میں جو لوگ ان دونوں شکلوں کو پھر سے ملا کر ایک زبان بنانا چاہتے ہوں انھیں کسی تیسرے نام کا سہارا لینا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں اس سچائی کو محسوس کر کے ہی آپ نے خود کچھ سال پہلے 'ہندستانی' شبد (لفظ) کو استعمال کیا تھا اور ملک کو سکھایا تھا، پھر اب وہ حالت بدل گئی۔

(۳) آپ کے یہ الفاظ پڑھ کر "اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ وے (یعنی اردو والے) بھاشا (زبان) کا ویاکرن (قواعد) بھی بدل دیتے ہیں"۔ مجھے اور بھی دکھ اور حیرانی ہوئی۔ پچھلے پانچ سات سو برس کے اندر اندر کی ہندستانی زبان کی مختلف شکلوں پر جتنی اونچی کھوج (تحقیق) گزشتہ تیس سال میں مولانا عبدالحق نے کی ہے شاید کسی دوسرے نے نہیں کی۔ اس کے علاوہ اگر آپ اردو ہندی دونوں کے ودوان (عالم) منشی پریم چند سے دریافت کر لیتے۔ تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ اصلیت اس سے ٹھیک برعکس ہے۔ مجھے خود کم سے کم اٹھائیس سال سے آج کل کی اکثر ہندی (اس شبد (لفظ) کا استعمال میں مروجہ ہی معنی میں کر رہا ہوں) مصنفوں سے اس معاملے میں کافی شکایت ہے۔

شاید آپ کے دھیان میں یہ بات نہیں ہے کہ اس وقت کی کتابی ہندی ہندستان کے کسی بھی ضلع یا گھر یا گاؤں کی بول چال کی زبان نہیں ہے۔ الٰہ آباد کے تعلیم یافتہ سے تعلیم یافتہ پنڈت (کاشمیریوں کو چھوڑ کر) جب اپنے گھروں میں بات چیت کرتے ہیں "ہمرے دوارے اک مہرارو کھڑی با" (ہمارے دروازے پر ایک عورت کھڑی ہے) بنارس کے پنڈت تو اور بھی عجیب زبان بولتے ہیں، جس کو نہ میں سمجھتا ہوں نہ لکھ سکتا ہوں۔ ان الٰہ آبادی اور بنارسی زبانوں کا ویاکرن (قواعد) ہندی یا اردو کے ویاکرن سے بالکل ایک مختلف چیز ہے۔ کشمیری بلاشبہ خاص ہندستانی بولتے ہیں، لیکن اگر ان کی بول چال کی زبان کو اردو یا ہندی دونوں میں سے ایک نام دینا پڑے تو وہ اردو ہے ہندی نہیں۔ اگر آپ کسی ان پڑھ کشمیری بڑھیا کو پکڑ کر اسے کسی اردو اخبار کا ایک کالم پڑھ کر سنائیں، اور پھر اسی مضمون پر کسی ہندی سماچار پتر (اخبار) کا ایک کالم سنائیں تو جتنا اردو اخبار سے اس کے پلے پڑ سکے گا اتنا ہندی سماچار پتر سے نہیں پڑے گا۔ برخلاف اس کے آج کل کی اردو بلاشبہ کچھ مقاموں کی بول چال کی زبان ہے۔ لکھنؤ، دلّی، میرٹھ، مرادآباد اور آس پاس کے کچھ علاقوں میں بھی خالص اردو بولی جاتی ہے۔ لکھنؤ اور دلّی کی زبانوں میں بھی فرق ہے لیکن وہ اتنا باریک ہے کہ بڑے سے بڑے ودوشی یا دیگر صوبوں کے عالم بھی کبھی کبھی اسے نہیں پکڑ پاتے۔

آپ کی اجازت سے میں اپنے ہی گھر کی مثال دینا چاہتا ہوں۔ میری دادی مہابن کی رہنے والی تھیں جو برج کا مرکز ہے اور ان پڑھ تھیں۔ ماں دلّی کی تھیں اور صرف ناگری حروف پڑھ سکتی تھیں۔ میرے گھر میں ٹھیک یہی زبان بولی جاتی تھی جس میں میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ محض دو باتوں میں فرق تھا۔ ایک تو سنسکرت شبدوں کی جگہ اردو فارسی سے زیادہ عام فہم الفاظ تھے اور دوسرے وہ زبان زیادہ بامحاورہ تھی، میری زبان ادھر ادھر گھومنے اور ہر طرح کی چیزیں پڑھنے کی وجہ سے بگڑی ہوئی ہے۔ میری ان پڑھ دادی رن نہیں سمجھتی تھیں قرضہ سمجھتی تھیں۔ 'بدھائی' کی بجائے ان کی زبان پر مبارک باد زیادہ چڑھا ہوا تھا اور منش، جیب، پرتھوی، دشا وغیرہ کی جگہ آدمی، زبان، زمین اور حالت لفظوں کا استعمال کرتی تھیں۔ یہی زبان میری ماں کی زبان تھی۔

اگر اردو اور ہندی کو دو الگ الگ زبانیں شمار کریں تو یہ بات بالکل سچ ہے کہ ہندی کہیں کی بھی بول چال کی زبان نہیں ہے، اردو ہے۔ یہاں میرا مطلب کھڑی بولی ہندی سے ہے۔ برج بھاشا یا اودھی تو ویاکرن (قواعد) کے خیال سے ہندی اردو سے بہت دور ہیں، اسی لیے مولانا عبدالحق نے ناگپور میں آپ سے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ اردو زبان میں ہندی کے الفاظ اور محاورے جس کثرت سے ہیں خود ہندی زبان میں اس قدر نہیں ہیں۔ یہ بھی بالکل سچ ہے کہ آج کل کی ہندی زیادہ تر کتابی اور

(بقیہ صفحہ ۹ پر)

مدیر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں — مطبوعہ: ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲ - راؤز ایوینیو، نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237212, 23237214
E-mail: hamarizaban@atuh.org
http://www.atuh.org